© rasailojaraid.com

تصوّر مساوات کا پس منظر

جناب سلطان احمد اصلاحی

انسانی زندگی میں کچھ قدریں ہمیشہ سے ایسی رہی ہیں جنھیں عزت واحترام کی نظروں سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ اور ان کے حصول کو انسان اپنی زندگی کے اہم ترین مقاصد میں شمار کرتا رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج کی متمدن دنیا میں ان کا تذکرہ کچھ زیادہ شد و مد کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اور فضا میں ہر طرف ان کی گونج سنائی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر امن، آزادی، اجتماعی عدل اور بنیادی حقوق وغیرہ۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں یہ اور ان جیسی دوسری اقدار کی حیثیت مسلمات کی سی ہو گئی ہے کہ متمدن دنیا کا ہر شخص انھیں تسلیم کرتا اور ان کی وکالت کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ عوامی سطح پر بھی ان اقدار کا برابر چرچا رہتا ہے اور حکومت کے ایوانوں میں بھی ہر جگہ ان کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ موجودہ دنیا کی انہی مسلمہ اقدار میں مساوات کا بھی شمار ہوتا ہے۔

مساوات کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے سارے انسان چونکہ پیدائشی طور پر یکساں ہیں اس لئے انھیں یکساں حقوق واختیارات بھی حاصل ہونے چاہئیں۔ مساوات کے ساتھ عام طور پر آزادی اور اخوت کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ 'مساوات' کے ساتھ ان کا ربط اتنا گہرا ہے کہ ان کے بغیر مساوات کے تصور کی تکمیل نہیں ہوتی۔

امریکہ کی آزادی کا منشور

حالیہ دور میں ریاستی سطح پر ان اقدار کا تذکرہ سب سے پہلے ہمیں امریکہ کے ۴ر جولائی ۱۷۷۶ء کے آزادی کے اعلامیہ (AMERICAN DECLAR-ATION OF INDEPENDENCE) میں ملتا ہے جس میں اس چیز کو ایک بدیہی حقیقت کے طور پر تسلیم کیا گیا تھا کہ:۔

"سارے انسان یکساں پیدا کئے گئے ہیں اور اپنے خالق کی طرف سے انھیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

> کچھ حقوق عطا کئے گئے ہیں جو غیر منفک ہیں۔ مثال کے طور پر زندگی، آزادی اور خوشی کی تحصیل وغیرہ ؎۵

اس مرحلے پر جن لوگوں نے اس تصور کی حمایت کی ان میں جان آدمس JOHN-ADAMS۔ ٹامس جفرسن THOMAS JEFFERSON اور ٹامس پین THOMAS PAINE کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

یورپ میں تصورِ مساوات کا عہد بہ عہد ارتقاء

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی برطانوی استعمار سے آزادی اور اس کے ساتھ آزادی کا یہ اعلامیہ دراصل نقطۂ عروج تھا آزادی و مساوات کے اس تصور کا جس کے تھوڑے بہت نشانات ہمیں یورپ میں رومن امپائر کے دور سے ہی ملتے ہیں۔ رومی قانون میں رواقی فلسفے (STOICISM) کے زیر سایہ انسانوں کی آزادی اور اخوت و مساوات کے تصورات پہلے ہی سے موجود تھے۔ اس کے بعد رومن امپائر میں دو عناصر مزید شامل ہوئے۔ ایک طرف مسیحیت آئی اور دوسری طرف ٹیوٹانی اقوام (TEUTONIC-NATIONS) کا اضافہ ہوا اور یہ دونوں بھی انسانوں کی آزادی اور ان کی مساوات کے قائل تھے۔ جہاں تک مسیحیت کا سوال ہے تو اس کی بنیاد ہی اس حقیقت پر تھی کہ مسیح کی نظر میں تمام انسان برابر ہیں۔ اور انسانی زندگی میں اصل اہمیت فرد کی ہے جیسا کہ عہد نامہ جدید میں ہے:

> "نہ کوئی یہودی رہا نہ یونانی، نہ کوئی غلام نہ آزاد، نہ کوئی مرد نہ عورت، کیونکہ تم سب مسیح یسوع میں ایک ہو۔" (گلتیوں کے نام پولس رسول کا خط باب ۳، ۲۸) ؎۶

چنانچہ اس زمانہ میں مسیحی مبلغین (FATHERS) عام طور پر اس کا درس دیا کرتے تھے کہ فطرت کے لحاظ سے سارے انسان آزاد اور برابر ہیں۔ رہیں ٹیوٹانی اقوام جنھوں نے رومن امپائر کا تختہ الٹ کر اس میں ایک نئے خون کا اضافہ کیا تو چونکہ یہ جنگ جو اقوام تھیں اس لئے ان کے اندر فطری طور پر آزادی و خود مختاری کے تصورات نہ صرف یہ کہ موجزن تھے بلکہ وہ اس کی علمبردار بھی تھیں

؎۵ Chamber's Encyclopaedia Vol VI London 1874 - (Liberty, Equality, Fraternity P. 113)

؎۶ عہد نامہ جدید صفحہ ۲۳۰ [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چنانچہ ان کے نزدیک شخصی آزادی کو غیر معمولی قدر و قیمت حاصل تھی۔ یہ لوگ فرد کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اور کسی آزاد انسان کی آزادی میں دخل اندازی کو روا نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے زیر اقتدار حکومت کے جن اداروں کی تشکیل ہوئی وہ بھی شخصی آزادی اور شخصی حقوق کے تصور کی عکاسی کرنے والے تھے۔

اس کے بعد کی یورپ کی تاریخ جاگیرداری بادشاہت اور مسیحی استبداد کی تاریخ ہے۔ جس میں آزادی و مساوات کے نقوش اس قدر مدھم ہیں کہ انھیں نہ ہونے کے برابر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس پورے عرصے میں یورپ کی آبادی دو طبقوں میں منقسم رہی۔ ایک طرف جاگیردار، بادشاہ اور کلیسا جو اپنی حکمرانی کا سکہ جمائے ہوئے تھے۔ اور دوسری طرف محکوم عوام، جن کی اس دنیا ہی کی نہیں بلکہ دوسری دنیا کی نجات بھی اس سے وابستہ تھی کہ وہ بلا چون و چرا اپنے حکمرانوں کی اطاعت کرتے چلے جائیں۔ اور آزادی و مساوات اور دوسرے انسانی حقوق کی آواز کبھی بھولے سے بھی اپنی زبان پر نہ لائیں۔ معاملات کی یہ رفتار معمولی تغیرات کے ساتھ سولھویں اور سترھویں صدی کے عرصے تک جاری رہتی ہے۔ جبکہ جاگیرداری، شاہی اور اس کے ساتھ ہی کلیسائی نظام کی بساط الٹ کر جمہوریت، آزادی اور مساوات انسانی کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ سرزمین یورپ کی حکمران اور عوام کی کشمکش کی یہ داستان اپنا ایک طویل سلسلہ رکھتی ہے۔ جس کا آغاز پانچویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے پانچویں صدی عیسوی میں رومن امپائر کے زوال کے بعد یورپ چھوٹی چھوٹی جاگیرداریوں میں منقسم ہو گیا۔ جس کی آپس کی آویزشوں، معاشی ابتری اور امن و امان کی بدتر صورتحال سے عاجز آ کر اور اس کے ساتھ ہی مسیحیت کی عطا کردہ اس پیاس کے زیر سایہ کہ روئے زمین پر ایک عالمی کلیسا (WORLD CHURCH) - اور ایک عالمی شہنشاہیت کی حکومت ہونی چاہیئے۔ دسویں صدی عیسوی میں ہولی رومن امپائر کے نام سے رومن امپائر کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ جسے بالآخر جاگیرداروں (FEUDALS) - اور رئیسوں (NOBLES) کے بڑھتے ہوئے اثرات کے باعث ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ رومن امپائر کے آغاز سے لیکر اس پورے عرصے میں کلیسا اور پاپائیت کو حکومت کے اوپر غیر معمولی اثر و رسوخ حاصل رہا۔ لیکن گیارھویں اور بارھویں صدی میں جب جاگیرداری نظام کو مزید استحکام حاصل ہوا تو اس کے ساتھ کلیسا کے اقتدار میں بھی غیر معمولی اضافہ ہو گیا یہاں تک کہ بادشاہ اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پوپ دونوں ایک دوسرے کے مدمقابل آ کھڑے ہوئے۔ جس میں بالآخر فتح کلیسا کو نصیب ہوئی، اس کے بعد آہستہ آہستہ جاگیرداری کا زوال شروع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی کلیسا کے اثرات بھی کم ہونا شروع ہوئے۔ اس صورتِ حال نے جاگیرداری کی جگہ قومی بادشاہتوں (NATIONAL MONAR-CHIES) کو جنم دیا۔ ان قومی بادشاہتوں کی راہ روکنے کی خاطر سماج کے سربرآوردہ طبقات (PRIV-ILEGED CLASSES) نے عوام الناس کے ساتھ مل کر شاہی اقتدار پر روک لگانی چاہی، اور عوام کو آزادی کا حق عطا کرنا چاہا۔ چنانچہ ۱۲۱۵ء میں برطانیہ میں MAGNA CARTA کی صورت میں عوام کو جزوی طور پر ان کی آزادیوں کی ضمانت عطا کی گئی۔

اس مرحلے پر یورپ میں شہروں اور ان میں بسنے والے تجارت پیشہ طبقات کو سماج کے اندر اتنی اہمیت حاصل ہو چکی تھی کہ اب انھیں نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ ان حالات کا رخ دیکھ کر کلیسا پھر قومی بادشاہتوں کا حلیف بن گیا۔ اور ان کے ساتھ مل کر عوام کا استحصال شروع کیا کہ ان کی لوٹ کھسوٹ کو دیکھ کر خود کلیسا سے بھی نہ رہا گیا۔ چنانچہ اس کے بطن سے سولہویں صدی کی پروٹسٹنٹ رفارمیشن (PROTESTANT REFORMATION) کی تحریک پیدا ہوئی۔ پروٹسٹنٹ تحریک نے کلیسا کا زور توڑنے کے لئے قومی بادشاہتوں کا ساتھ دیا۔ اور اس مقصد کی تکمیل کی خاطر 'انسانی مساوات' کا نعرہ بلند کیا۔ فوری طور پر اگرچہ یہ چیز ریاستوں کے استحکام کا سبب بنی جس کے زیرِ سایہ کلیسا پھر مسندِ اقتدار پر متمکن ہو گیا۔ لیکن بالآخر یہ چیز فرد کی آزادی اور جمہوریت کی لہر کو تیز تر کرنے کا پیش خیمہ بنی۔ اب گویا بادشاہ اور عوام کے درمیان ٹکر کے لئے اسٹیج تیار ہو چکا تھا۔

اس وقت سے لے کر اٹھارویں صدی کے اختتام تک اگرچہ یورپ میں ہمیں ایک طبقہ اس خیال کا حامی نظر آتا ہے کہ "بادشاہ اپنے ابدی حق کی وجہ سے حکومت کرتے ہیں" 'Kings are ruled by divine right' نیز یہ کہ عوام کا منصب بس اپنے حکمراں کی خاموش اطاعت (PASSIVE OBEDIENCE) ہے۔ لیکن اس کی مخالف لہر دن بدن زور پکڑتی گئی کہ سارے انسان برابر (EQUAL) ہیں ہر انسان کے کچھ فطری حقوق (NATURAL RIGHTS) ہیں اور عوام اور حکمراں کا رشتہ حاکم و محکوم کا نہیں بلکہ ایک سماجی معاہدے (SOCIAL CONTRACT) کا رشتہ ہے جس کے تحت ہر ایک پر کچھ ذمہ داریاں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور کچھ حقوق عائد ہوتے ہیں۔ یہ خیالات ہمیں چودہویں اور پندرہویں صدی کے مفکرین کے یہاں بھی ملتے ہیں مثال کے طور پر جان وائی کلف (JOHN WYCLIF 1320-1384) جان ہس (JOHN HUSS 1369-1415) اور نکولس آف کیوزز (NICHOLOS OF CUES 1401-1464) وغیرہ۔ لیکن سولہویں صدی سے لیکر اٹھارویں صدی کے عرصے میں یہ آواز مزید گھن گرج کے ساتھ سنائی دیتی ہے۔ جس کے سلسلے میں خاص طور پر ٹامس ہابس (THOMAS HOBBES 1588-1679) جان لاک (JOHN LOCKE 1632-1704) بینڈکٹ اسپنوزا (BENEDICT SPINOZA 1632-1677) جین جیکس روسو (JEAN JACQUES ROUSSEAV 1712-1787) کلینڈ ہیلویٹیس (CLANDE HELVETIUS 1715-1771) اور فرانسیسی قاموس نگار ڈیڈروٹ (DIDEROT 1713-1784) اور ڈی المبرٹ (D. ALEMBERT 1717-1783) وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ برطانیہ میں ان تصورات کی جھلک جزوی طور پر '1215' MAGNA CARTA کے بعد ۱۶۲۸ء کے PETITION OF RIGHTS اور اس کے بعد بالترتیب ۱۶۷۹ء اور ۱۶۸۹ء کے HABEAS CORPUS ACT اور 'BILL OF RIGHTS' کی دستاویزات میں دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس کا کامل ترین مظہر ۱۷۷۶ء کا امریکہ کی آزادی کا وہ اعلامیہ ہے جس کا حوالہ اس سے پہلے گزر چکا ہے۔ جس کی صدائے بازگشت اس کے تھوڑے ہی دن بعد ۱۷۸۹ء میں انقلاب فرانس کے موقع پر (DECLARATION OF THE RIGHTS OF MAN AND OF CITIZEN) کی صورت میں ہمیں سنائی دیتی ہے۔[۲]

---

[۱] یہ تمام معلومات لارنس سی۔ ونلاس LAWRENC C. WANLASS کی کتاب 'HISTORY OF POLITICAL THOUGHT' سے ماخوذ ہیں البتہ اس سلسلے میں سنین کا اضافہ کہیں کہیں ہم نے الگ سے کر دیا ہے۔

[۲] اس سلسلے میں ہم انسانی حقوق (HUMAN RIGHTS) سے متعلق اقوام متحدہ (U.N.O) کی دسمبر ۱۹۴۶ء اور دسمبر ۱۹۴۸ء وغیرہ کی قراردادوں کا حوالہ نہیں دے رہے ہیں کہ دراصل یہ وہی پرانی شراب ہے جو نئے جام میں پیش کی گئی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس تصور کے نقائص اور اس کے مخالف تصورات

سرزمین یورپ سے اٹھنے والا آزادی و مساوات کا یہ تصور اپنے اندر جو نقائص رکھتا ہے اسے بادنیٰ تامل محسوس کیا جاسکتا ہے۔ کہ یہ آزادی و مساوات کا کوئی آفاقی تصور نہیں، جو اپنی کوئی واقعی بنیادیں رکھتا ہو۔ اور پھر اس کے نتیجے میں آفاقیت کا علمبردار کوئی معاشرہ وجود میں آیا ہو۔ اس کے برعکس یہ چیز وہاں کے مخصوص حالات کی پیداوار ہے۔ اور حکمران اور عوام کی کشمکش کے بطن سے وجود میں آئی ہے۔ اس لئے اس کا نہ کبھی کوئی آفاقی کردار رہا ہے اور نہ تو اس سے اس کی توقع رکھی جانی چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ ابتدا میں مسیحیت نے اسے آفاقی رنگ دینا چاہا، لیکن چند قدم سے زیادہ وہ اپنی یہ حیثیت برقرار نہ رکھ سکی۔ اس سے بھی بڑی بدقسمتی یہ رہی .... کہ اس کے ساتھ ہی یورپ میں کچھ ایسے تصورات و نظریات پیدا ہوئے جنھوں نے آزادی و مساوات کے اس دھندلے تصور کو بھی خاک میں ملا دیا۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ نظریات تصور مساوات کے عین ضد تھے اور بالکلیہ اس کی نفی کرنے والے تھے، ہماری مراد فاشزم، ریشنزم، اور بالشوزم وغیرہ کے تصورات سے ہے۔ اس لئے کہ ان کے اندر فرد کی شخصیت کو ریاست کے اندر گم کر دیا گیا تھا اور اس کے لئے منتہائے کمال اسے قرار دیا گیا تھا کہ وہ ریاست کے حق میں اپنے جملہ حقوق و مطالبات سے دستبردار ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں دوسرے انسانی حقوق کی طرح آزادی و مساوات کی قدروں کی پامالی بھی یقینی تھی، جس طرح مساوات کا مذکورہ تصور ارتقاء کی ایک طویل منزل طے کرنے کے بعد اپنے آخری مقام تک پہنچا تھا، مساوات کے مخالف یہ تصورات بھی اپنے ارتقاء کی ایک داستان رکھتے ہیں، جس کا آغاز جرمن آئیڈیلزم سے ہوتا ہے۔

جرمن آئیڈیلزم

انقلاب فرانس کے بعد یورپ میں جو حالات رونما ہوئے اور جس کے نتیجے میں مغرب میں لادینیت اور انفرادیت پسندی (INDIVIDUALISM) کے رجحانات پیدا ہوئے۔ مذہبی طبقے اور سوسائٹی کے متوسط طبقات کی طرف سے اس کے خلاف جو ردعمل ہوا فاشزم (FACISM) اس کا مظہر تھا جس کے خاص مراکز جرمنی اور اٹلی رہے ہے۔ اس تصور کی ابتدا جرمن مثالیت' (GERMAN IDEALISM) کی صورت میں ہوئی جس میں افلاطون اور ارسطو کے خیالات کی پیروی کرتے ہوئے 'فرد' کو 'ریاست' میں گم کر دیا گیا تھا۔ اور جس کے اندر آزادروی کے مقابلے میں خود عائد کردہ پابندی (SELF-IMPOSED DUTY) کو اور عقل کے مقابلے میں جذبات کو کلیدی اہمیت دی گئی تھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس تصور کی بنیاد رکھنے والوں میں کانٹ (IMMANUEL KANT (1724 - 1804)، جان فش (TOHANN FICHTE (1762 - 1814)، اور ہیگل GEORGE WILHELM HEGEL (1770 - 1831) کا نام سرفہرست ہے۔ خاص طور پر ہیگل جسے کہ فاشزم کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔

ان مفکرین نے اپنے سیاسی اصولوں کی بنیاد تجربہ و مشاہدہ کے مقابلے میں خالص فکر 'PURE - THOUGHT' کے اصول پر رکھی اور سیاسیات میں باطنی امنگ (WILL) کے تصور کو سب سے انتہائی عنصر قرار دیا۔ انھوں نے اپنی فکر کا آغاز تو انقلاب فرانس کے آزاد پسند اور آفاقی تصورات سے کیا لیکن بعد میں اس کی مخالف سمت میں ترقی کرتے گئے جس کا منشا اپنی قومی ریاست کی عظمت (GLORIFICATION) اور جرمن قوم کے لازوال مشن میں ایک توہماتی یقین تھا جیسا کہ ظاہر ہے مثالیت کے اس تصور کے عین مزاج کا اقتضا ہے کہ انسانی زندگی میں آزادی کی قدر کو کوئی مقام حاصل نہ رہے۔ اصل چیز 'ریاست' اور اس کی 'عظمت' ہے اور اس کے بالمقابل فرد کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسے اس عظمت کے حصول کے لئے بطور آلہ کار کے استعمال کیا جائے۔ اس کے بعد کلیت پسندی کا یہ قافلہ ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور رومانویت کی صورت اختیار کرتا ہے۔

رومانٹسزم (ROMATECISM) فاشزم کے ارتقائی مرحلے کی یہ دوسری منزل ہے اور اپنی پیدائش کے لئے انقلاب فرانس کے خلاف یورپ کے اسی فلسفیانہ ردعمل کی رہین منت ہے۔ اس تصور نے اپنے ماننے والوں کے اندر اکابر پرستی کا بیج بویا اور اپنی قوم کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہ کسی مخصوص قسمت کی مالک ہے۔ اور زندگی کے اسٹیج پر اسے کوئی خصوصی کردار ادا کرنا ہے۔ جس کا نتیجہ ہوا کہ لوگ اپنی مشترک قومی اصلوں (ORIGINS) پر بیش از بیش فخر کرنے لگے۔ اور ان کے اندر مخصوص طور پر اپنی قوم کی برتری کا احساس بڑھتا گیا۔ جس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے نئے سرے سے اپنی تاریخ میں دلچسپی لینی شروع کردی۔ اور سیاسی مسائل کو تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھا جانے لگا۔

نیشنلزم آگے جب یہ لہر کچھ اور تیز ہوئی تو اس نے نیشنلزم یعنی قومیت پرستی کی صورت اختیار کی جس کا سہرا بھی جرمنی ہی کے دو مفکروں ٹریٹسکی HEIN VON TREITSCHKE

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(1834-1896) اور سیوگنی FRIEDRICH KARAL VON SAVIGNY (1779-1861) کے سر بند تھا ہے جسے صحیح تر لفظوں میں جارحانہ قوم پرستی ہی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ٹرٹیسکی کا کہنا تھا کہ جرمنی کو چاہئے کہ اپنی طبعی حدود کو یوں ہی خالی ٹرانہ رہنے دے اسی طرح اسے اپنی آبادی کے مختلف عناصر کو ایک وحدت میں ضم کر لینا چاہئے اور اپنی تہذیب کے دائرے کو پست اقوام تک وسیع کر دینا چاہئے۔ خواہ اس کے لئے جنگ ہی کی ضرورت کیوں نہ ہو۔ ٹرٹیسکی اپنی تصنیفات کے ذریعہ مسلسل اس بات کی تلقین کرتا رہا کہ ریاست کی تعمیر میں جو طریقۂ کار اور جو تدابیر بھی اختیار کی جائیں سب حق بجانب ہیں۔ اس راہ میں ریاست اپنے شہریوں کی قربانی بھی دے سکتی ہے۔ اور دوسری قوموں کو بھی قربانی کی بھینٹ چڑھا سکتی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک مضبوط ریاست ہی جرمنی کی تہذیب کا تحفظ کر سکتی اور اس کے عوام کے لئے مضبوطی اور اتحاد قائم کر سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے سامعین کو جرمنی کی تاریخی عظمت کا درس دیتا اور انھیں اس بات کی خوش خبری سناتا کہ اعلیٰ قسمت (EXALTED DESTINY) اس کی چشم براہ ہے۔

یہی خیالات سیوگنی کے بھی تھے۔ اس کا اصرار تھا کہ اپنے افراد کے مقابلے میں ریاست کی زندگی کو بالاتری حاصل ہونی چاہئیے۔ اپنے ان خیالات کے ذریعہ اس نے اس رجحان کو تقویت دی جس کے نتیجے میں کامل کلیت پسندی (ABSOLUTISM) کا پیدا ہونا یقینی تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ عوام کو ذرا بھی سیاسی اقتدار نہیں ملنا چاہئیے۔ یہاں تک کہ انھیں ریاست کے تحت منظم کر دیا جائے جس کی بدولت ہی ان کے لئے اپنی شخصیت اور اپنے اقتدارِ اعلیٰ کا حصول ممکن ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا کہنا تھا کہ اقتدارِ اعلیٰ کسی ایک نسل میں مرتکز نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ ریاست اپنی جلو میں بہت سی نسلوں کو سمیٹے ہوتی ہے جس کا تعلق ماضی کی نسلوں سے بھی ہوتا ہے اور ان سے بھی جو ابھی پیدا نہیں ہوئی ہیں۔ ریاست کی تشکیل کسی قوم (NATION) کی تاریخ اور اس کی زندگی سے ہوتی ہے۔ یہ دراصل ایک ایسی تخلیقی قوت کا نتیجہ ہوتا ہے جو اندر ہی اندر کام کرتی رہتی ہے۔

[illegible] ارتقائی مرحلے [illegible] ریشزم (RACISM)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یعنی نسل پرستی کی صورت اختیار کی جس نے یورپ کے ایجاد کردہ تصورِ مساوات کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی اور حقیقت یہ ہے کہ فاشزم کے مختلف پہلوؤں میں کسی دوسرے نظریے کے اتنے انقلابی نتائج نہیں رہے جتنے کہ نسلی برتری (RACIAL SUPERIORITY) کے اس تصور کے رہے جیسے ارتھر ڈی گوبینو (ARTHUR DE GOBINEAU (1816-1882) اور ہسٹن اسٹیورٹ چیمبرلن (HOUSTON STEWART CHAMBERLIAN (1855-1926) نے پیش کیا۔ یہ اسی تصور کا نتیجہ تھا کہ جرمنی میں لاکھوں یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ یا انھیں خانماں برباد دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے مجبور کردیا گیا۔

گوبینو جو اس مکتب خیال کا بانی تھا۔ ایک سائنس داں کی بہ نسبت شاعر زیادہ تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک نئی سائنس ' ایجاد کرنے سے باز نہ رہا جس کا مرکزی نکتہ ' انسانی نسلوں کی عدم مساوات ' تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ نوع انسانی کو تین متمائز نسلوں (DISTINCT RACES) میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ نیگرو، چینی اور یورپین، اس کے خیال میں ہر نسل کی کچھ امتیازی خصوصیات ہیں اور انہی خصوصیات کی نسبت سے وہ دوسروں سے برتر یا ان سے کمتر ہے۔ ذہن و دماغ (INTELLECT) کے لحاظ سے نیگرو سب سے پست اور یورپین سب سے فائق ہیں۔ ہاں آرٹ اور موسیقی کی صلاحیت میں نیگرو آگے ہیں۔ چینیوں کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ یہ لوگ عملی زیادہ ہوتے ہیں اور ان کے اندر قانون کی پابندی کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ البتہ ان کے اندر بڑے لیڈر اور بڑے دماغ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں۔ اس کے خیال کے مطابق سفید فام لوگ عقل (REASON) قوت کار (ENERGY) اور تخلیقیت (RESOUCEFULNESS) اور قابلیت (CREATIVENESS) میں زیادہ مالدار ہیں۔ اگرچہ ان میں تمام لوگ یکساں عالی دماغ اور صاحب صلاحیت نہیں ہوتے ہیں مثال کے طور پر سامی اقوام (SEMITES) دوسرے سفید فام طبقات کے مقابلے میں کمزور صلاحیت کی مالک ہوتی ہیں اس لئے کہ یہ لوگ دراصل سفید فام اور سیاہ فام دونوں نسلوں کا مرکب (COMBINATION) ہیں۔ سفید فام طبقات میں سب سے عمدہ اور خالص آریہ نسل ہے جو جرمنی اور انگلینڈ میں پائی جاتی ہے اور جس کے بقایا ہمیں فرانس کے نوابوں کے یہاں ملتے ہیں۔

گوبینو کے خیال کے مطابق اس نسل کو کامل طور پر آریہ رکھنا شاید ممکن نہ ہو سکے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن موجودہ صورت میں گھٹیا نسلوں کے خون کی کثافت سے آرین نسل برباد ہوئی جاتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر یہ عمل (PROCESS) جاری رہا تو یورپین تہذیب کا مستقبل خطرے میں پڑ جائیگا۔

چیمبرلین جو اپنی پیدائش کے لحاظ سے تو برطانوی تھا لیکن بعد میں جرمن شہریت اختیار کر لی تھی۔ اس نے جرمنی میں ان خیالات کی خوب تشہیر کی گوبینو کی طرح اس نے بھی یہی استدلال پیش کیا کہ انسانی نسلیں اپنی خصوصیات کے لحاظ سے باہم اتنی ہی مختلف ہیں جتنی کہ جانوروں کی نسلیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ انسانی نسلیں اپنے عادات و اطوار میں درحقیقت اتنی ہی مختلف ہوتی ہیں جتنی کہ مختلف نسلوں کے کتے۔ مثال کے طور پر تازی کتا، بڑے سر والا کتا، گھونگھریالے بالوں والا کتا اور اسپانیل کتا جو تیراکی میں مشہور ہے۔ آریائی نسل اور خاص طور پر اس نسل کا ٹیوٹانی طبقہ دوسری تمام نسلوں سے بنیادی خصوصیات، میں فائق تر ہے۔ اس لئے کہ آرٹ، فلسفہ، مذہب اور سیاسیات کے میدانوں میں تمام تر ترقیاں اسی کی رہین منت ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ ٹیوٹانی خون ہی دراصل انسانی تہذیب کی جان ہے۔ اپنے ارد گرد کا مشاہدہ ہمارے سامنے یہ گواہی پیش کرے گا کہ کسی قوم (NATION) کی اہمیت کا انحصار اس حقیقت پر ہے کہ وہ اپنے آبادی میں ٹیوٹانی خون کس تناسب (PROPORTION) سے رکھتی ہے۔ اس کے خیال میں سب سے زیادہ ٹیوٹانی خون جس قوم کے اندر ہے وہ جرمن قوم ہے۔ جرمن آبادی کو اس سلسلے میں وہ فوقیت حاصل ہے کہ اس کے ذریعہ ایک شاہ نسل (MASTER RACE) تشکیل پاتی ہے جس کی قسمت میں پہلے سے لکھا ہوا ہے کہ اسے آنے والی بہت سی صدیوں تک دنیا کی تہذیبی اور سیاسی قیادت کا فرض انجام دینا ہے۔

فاشزم کا انتہائی مرحلہ

آزادی و مساوات کی اعلیٰ انسانی قدروں کی بیخ کنی کرنے والے فاشزم کے اس تصور نے دنیائے انسانیت کو تباہی و بربادی کے کس الاؤ میں جھونکا ہے، اس کو دیکھنے کے لئے ہمیں فاشزم کے انتہائی مرحلے پر ایک نظر ڈالنی ہوگی۔ یہ ۱۹۲۲ء کا زمانہ جب فاشزم کا تصور اپنے اصلی روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اور یہی وہ مرحلہ ہے جہاں سے اس کے سیاسی کردار کا آغاز ہوتا ہے۔ اب تک فاشزم کا تصور جن شکلوں میں نمودار ہوا تھا، وہ کچھ کم خوفناک نہ تھیں۔ لیکن ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے بعد اس کی خوفناکی اپنی آخری انتہا کو پہنچ گئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روس کے اس سرخ انقلاب کو دیکھ کر اٹلی اور جرمنی کے صاحب ثروت طبقے کے کان کھڑے ہو گئے، اور ان کے پاؤں تلے سے زمین سرکنے لگی۔ اور ان کے سفید فام متوسط طبقوں (MIDDLE CLASSES) کے اندر خوف و ہراس کی فضا پھیل گئی۔ اس خطرے سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے اس سے بہتر کوئی موقعہ نہ تھا کہ فاشزم کے اسلحے کو استعمال کیا جائے۔ جبکہ حالات کے اس رخ نے اسے مزید دھاردار کر دیا تھا۔ یہی پس منظر تھا جب اٹلی میں مسولینی - BENITS MUSSOLINI (1883 - 1945) اور جرمنی میں ہٹلر - ADOLF HITLER (1889 - 1945) منصۂ شہود پر آئے جن کے ہاتھوں فاشزم کی انتہاپسندی اپنی تمام فتنہ سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔ اور آزادی و مساوات کی اعلیٰ انسانی قدروں کو تو چھوڑیئے، خود انسانیت کے حق زیست کے لالے پڑ گئے۔

فاشزم کے ان علمبرداروں نے ایک طرف تو اپنی قوم کے اندر اپنی نسلی برتری (RACIAL - SUPERIORITY) کے احساس کو مزید تقویت دی۔ اور اس طرح اپنی قوم کے اندر ایک طرح کے جنون کی کیفیت پیدا کر دی۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ریاست کے حقوق ایسا بڑھا چڑھا کر پیش کئے کہ اس کے بالمقابل فرد کی شخصیت بالکل گم ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ یہ نعرہ دیا گیا کہ "تاریخ کے باہر آدمی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔" (OUTSIDE HISTORY MAN IS NOTHING) نیز آزادی ایک حق نہیں بلکہ ایک ڈیوٹی ہے - (LIBERTY IS NOT A RIGHT BUT - A DUTY) اور "آزادی کی کوئی حقیقت نہیں سوائے اس آزادی کے جو ریاست فراہم کرتی ہے - (THERE IS NO LIBERTY BUT THE LIBERTY WHICH - IS INHERENT IN THE STATE) اسی طرح قوم (NATION) کے سلسلے میں یہ کہا گیا کہ تمام چیزیں اور اشخاص قوم کے تابع ہیں۔ اور ریاست ہی وہ چیز ہے جس کے ذریعہ انھیں اپنے وجود کا تشخص ملتا ہے۔ قوم کے سلسلے میں بیشک افراد کی ذمہ داریاں ہیں لیکن قوم اپنے معاملے میں کسی کی پابند نہیں۔ اسی طرح ریاست کے بالمقابل فرد کی حیثیت یہ بیان کی گئی کہ "ریاست کے دائرے میں رہ کر ہی فرد اپنی شخصیت کا اظہار (REALIZE) کر سکتا ہے۔ ہر چیز ریاست کے اندر، ریاست کے خلاف کچھ نہیں اور ریاست کے باہر کچھ نہیں (EVERY-

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

THING WITHIN THE STATE, NOTHING AGAINST THE -STATE, NOTHING OUTSIDE THE STATE)

اگر ایک طرف مسولینی نے ریاست کا یہ غالی تصور پیش کیا تو دوسری طرف ہٹلر نے اپنی قوم جرمن کے لئے شاہ نسل (MASTER RACE) ہونے کا دعویٰ کیا، اور دنیا کی دوسری تمام نسلوں کو اس کے مقابلے میں فروتر قرار دیا۔ یہ اسی نسل برتری کا نتیجہ تھا کہ تمام سچے نازیوں کے لئے یہودیوں کو ان کا مشترک دشمن (COMMON ENEMY) قرار دیا گیا۔ اور پوری یہودی قوم کو یا تو ملک بدر کر دیا گیا یا انھیں بالکل تہس نہس کر دیا گیا۔ اور جب برطانیہ و امریکہ سے اسی کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی تو اسے اس قدر احمقانہ حرکت تصور کیا گیا جس کی تردید کی بھی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اس کے ساتھ ہی جرمنی میں یہ نغمہ گایا جانے لگا کہ "ایک عوام، ایک نظام، ایک حکمران (ONE PEOPLE, ONE REICH, ONE FURHER) اور پھر جرمنی سے یہ چیخ بلند ہوئی کہ "ہم اپنے خون سے سوچتے ہیں - (WE - THINK WITH OUR BLOOD) اور اپنے سربراہ ہٹلر کو ناقابل خطا (INFALLIBLE) قرار دیا گیا۔

یہ اسی فاشزم کے تصور کا نتیجہ تھا کہ ایک طرف ہٹلر اور مسولینی نے اپنے اندرون ملک الحاد ازم کا خاتمہ کیا۔ اور پھر دنیا کی دوسری قوموں کو اپنے لئے کھلی چراگاہ تصور کرتے ہوئے عظیم اٹلی اور عظیم جرمنی کے اپنے خواب کی تعبیر کے لئے اسی جنون کے ساتھ میدان میں نکل آئے جس کے منحوس اثرات دنیائے انسانیت کے سامنے جنگ عظیم ثانی کی صورت میں نمودار ہوئے جس کے اندر آزادی اقوام اور انسانی مساوات کی اعلیٰ قدروں کو توڑ پھوڑ دیئے، انسانیت کے حق زیست کے تصور کی بھی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی گئیں۔

بالشوزم سرزمین یورپ سے اٹھنے والے ان فاشسٹ تصورات کی فہرست نامکمل رہے گی اگر اس میں بالشوزم کو شامل نہ کیا جائے۔ جسے سوشلزم اور کمیونزم کے دوسرے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کی امتیازی حیثیت، انسانوں کی معاشی فلاح کے اس انقلابی تصور کو حاصل ہے۔ اور اپنی اس حیثیت میں وہ دنیا کے کمزور انسانوں کی غلامی کی زنجیروں کو کاٹنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

والا اور اپنے تئیں ان کا نجات دہندہ ہونے کا مدعی بھی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے اوپر فاشسٹ تصور کی چھاپ اتنی گہری ہے اور اپنے اس مقصد کے حصول کی خاطر وہ جس طریقۂ کار کا قائل ہے، اس کے پیش نظر اسکی اس غالب عنصر کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے متعلق کوئی گفتگو کرنا سچ یہ ہے کہ اس کے ساتھ بڑی بے انصافی ہے۔ ..... کیمونزم کا مقصد ایک غیر طبقاتی سماج (CLASS LESS-SOCIETY) کا قیام ہے جس کے اندر سارے انسان یکساں ہوں۔ اور غریبی اور امیری کے فاصلوں کو یکسر مٹا دیا گیا ہو۔ پیداوار کے ذرائع پر تمام انسانوں کو یکساں مالکانہ حقوق حاصل ہوں۔ اور چھوٹے بڑے کا کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے کیمونزم دو کلیدی اصول پیش کرتا ہے (۱) طبقاتی جنگ اور (۲) پرولتاریہ کی انقلابی ڈکٹیٹرشپ۔ کہنے کو یہ بات کتنی اچھی ہے کہ سماج سے طبقہ واریت کا خاتمہ ہو جائے، سارے انسان برابر (EQUAL) ہو جائیں اور ان کے درمیان 'من وتو' کا کوئی امتیاز نہ رہے۔ لیکن اس مقصد کی تکمیل کے لئے وہ جس جبر و تشدد اور توڑ پھوڑ کا قائل ہے۔ اور اس کے لئے مزدور نمائندوں کی جس مطلق العنان حکومت کا تصور پیش کرتا ہے، جسے وہ پرولتاریہ کی انقلابی ڈکٹیٹرشپ' کا نام دیتا ہے۔ اس کے پیش نظر اگر اسے 'مزدور طبقات کے فاشزم (LABOU-R-CLASS FACISM) کا نام دیا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ کیمونزم اس سلسلے میں جس انتہا پسندی کا شکار رہا ہے اس کا اندازہ کمیونسٹ مینیفسٹو کے ان آخری فقروں سے لگایا جا سکتا ہے:-

> "کمیونسٹ اپنے خیالات اور اپنے عزائم کو چھپانے کو اپنے لئے باعثِ ننگ سمجھتے ہیں۔ وہ صاف صاف اس حقیقت کا اعلان کرتے ہیں کہ ان کا مقصد اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ موجودہ سماجی ڈھانچے کو بالکلیہ بجبر اکھاڑ پھینکا جائے۔ حکمراں طبقات کو چاہئے کہ وہ کمیونسٹ انقلاب کے امکانات کو دیکھ کر کانپ اٹھیں۔ مزدوروں کے پاس سوائے اپنی زنجیروں کے کھونے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ انھیں تو ایک دنیا فتح کرنی ہے۔ دنیا کے مزدورو! متحد ہو جاؤ" ؎۱

؎۱ Manifesto of the Communist party P.98-99 Foreign Languages publishing House Moscow 1949.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیمونزم کی اس انتہا پسندی کا اندازہ لینن (۱۸۷۰ - ۱۹۲۴) کے ان الفاظ سے بھی لگایا جاسکتا ہے:

"ہم ہر اس اخلاق کو رد کرتے ہیں جو عالمِ بالا کے کسی تصور پر مبنی ہو۔ یا ایسے خیالات سے ماخوذ ہو جو طبقاتی تصورات سے ماوراء ہیں۔ ہمارے نزدیک اخلاق قطعی اور کلی طور پر طبقاتی جنگ کا تابع ہے۔ ہر وہ چیز اخلاقاً بالکل جائز ہے جو پرانے نفع اندوز اجتماعی نظام کو مٹانے کے لئے اور محنت پیشہ طبقوں کو متحد کرنے کے لئے ضروری ہو۔ ہمارا اخلاق بس یہ ہے کہ ہم خوب مضبوط اور منظم ہوں۔ اور نفع گیر طبقوں کے خلاف پورے شعور کے ساتھ جنگ کریں۔ ہم یہ مانتے ہی نہیں کہ اخلاق کے کچھ ازلی و ابدی اصول بھی ہیں۔ ہم اس فریب کا پردہ چاک کرکے رہیں گے۔ اشتراکی اخلاق اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مزدوروں کی مطلق العنان حکومت کو مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے کے لئے جنگ کی جائے۔"

"ناگزیر ہے کہ اس کام میں ہر چال، فریب، غیر قانونی تدبیر، حیلے بہانے اور جھوٹ سے کام لیا جائے۔"[۱]

جب اس نظریئے کے صفِ اوّل کے حاملین کے یہ تیور اور ان کا یہ لب و لہجہ ہے تو ان کے عام پیرووں کے اندر غیر مزدور طبقات کے لئے بغض و حسد اور نفرت و عداوت کے جو جذبات کار فرما ہوں گے اس کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ عقل کہتی ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ دستوری یقین دہانیوں کے باوجود ایسے کسی طبقے کی طرف سے عام ابنائے انسانیت کے سلسلے میں عدل و انصاف اور آزادی و مساوات کی روش پر قائم رہنا ناممکن ہے۔ ماضی قریب میں سوویت روس کے اشتراکی انقلاب اور اس کے بعد اس کے پڑوسی ملکوں رومانیہ، بلغاریہ، پولینڈ اور چیکوسلواکیہ وغیرہ اور اب تازہ افغانستان میں اس نظریئے کے علمبرداروں کی طرف سے عام انسانوں کے سلسلے میں ظلم و بربریت کا جو مظاہرہ کیا گیا اور آگ و خون کی جو ہولی کھیلی گئی اور جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے وہ اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہے۔

---

[۱] اسلام اور جدید معاشی نظریات/ ۶۹

[۲] یہ تمام معلومات بھی لارنس سی ولاس کی کتاب مذکورہ 'History of Political Thought' اور ڈی۔ آر۔ بھنڈاری کی کتاب History of European Political Philosophy سے ماخوذ ہیں۔

© rasailojaraid.com